منبع کا پتا نہ چل سکا۔

رتھ ان کے نزدیک آتا جا رہا تھا۔ گورنر اپنی خفت چھپانے کو ناگواری سے ہنس رہا تھا اور کوئی بات کر رہا تھا۔ شہزادہ اس کی طرف دھیان دیئے بغیر گہری متردد نظروں سے برابر ان الفاظ کو تکے جا رہا تھا جو لکڑی کے تختے پر بن رہے تھے اور مٹ رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے چہرے پر فکر مندی کی کوئی علامت ظاہر نہ ہونے دی۔

ان کو اپنے سامنے پا کر آخر نعیم نے قدم بڑھایا۔ ''کاغذ نکالو۔'' اس نے کہا۔

وہ شہزادے پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔ نعیم اس کا بازو ہلا کر اونچی آواز میں چیخا۔ ''نکالو۔''

''ایں؟'' وہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔ ''تم نے بورڈ اتار لیا؟''

''ہاں...... ہاں۔''

''اچھا؟ مجھے دو۔''

نعیم نے بورڈ اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا جو اس نے ہاتھوں کو اٹھا کے پکڑ لیا اور شہزادے پر سے نظریں ہٹائے بغیر سحر زدہ سی کھڑی رہی۔ انہیں گزرتے ہوئے دیکھ کر نعیم نے سیدھے ہاتھ کے پورے زور سے اس کا بازو مروڑا اور سانپ کی طرح خاموشی سے پھنکارا۔

''بدبخت عورت...... جلدی کرو۔''

''او...'' [illegible] نعیم [illegible] کر آنکھیں بند کر لیں۔ بورڈ پانی میں گر پڑا۔

اب ان کے سامنے سے گھڑ سوار فوج کے جرنیل، حکومت برطانیہ کے نائب، والیان ریاست اور ان کے بعد درجہ بدرجہ سرکاری افسروں کی ایک لمبی قطار اپنی اپنی جگہ پر گھوڑوں، بگھیوں اور موٹروں پر گزر رہی تھی۔ دو رویہ فوجی جوان سلامی دیتے ہوئے یوں کھڑے تھے جیسے گاڑ دیئے گئے ہوں۔ پرنس آف ویلز اس دروازے کے نیچے سے گزر رہا تھا جس پر سے روشنی کے الفاظ کو ہٹا کر اب اگلے دروازے پر Project کیا جا رہا تھا۔ اچانک پرنس کے برابر والی گلی سے چند لوگوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ ان کے جسم ننگے اور سیاہ تھے اور سر منڈے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پیٹوں پر بڑے بڑے بورڈ باندھ رکھے تھے جن پر لکھا تھا:

"Tell your Mother , we are hungry."

چند ثانیے میں وہ ٹولی غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اسی گلی میں سے چند گائیں باہر ہانک دی گئیں جو فوجیوں کے درمیان سے سر نکال کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے گلوں میں بھی بورڈ لٹک رہے تھے جن پر رقم تھا:

"Tell your Mummy, we are dry."

نعیم عذرا کو تھام کر واپس چلنے لگا۔ عذرا کا سر ابھی تک اس کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ چلتے چلتے نعیم نے اس کے آہستہ آہستہ بڑبڑانے کی آواز سنی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید والا زاری کے

آثار تھے۔ نعیم کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر اس نے نظریں چرا لیں۔

"کوئی بات نہیں...... کوئی بات نہیں۔" نعیم نے فکر مندی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

الٹے لٹکتے ہوئے بورڈوں کے نیچے نیچے' ایک دوسرے کو تھامے ہوئے وہ چلتے گئے۔

(۲۱)

1924ء کے موسم گرما میں نعیم کو ایک اور بلا خیز تجربہ ہوا۔ وہ واقعہ اپنی جگہ پر ایک نیا تجربہ ہونے کے علاوہ اس کی زندگی میں ایک انوکھے' انجانے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ واقعہ اس روز پیش آیا جب چار دن کی مسلسل بارش کے بعد دھوپ نکلی تھی اور نعیم نے پہلی بار کسی اونچی جگہ سے مجمعے سے خطاب کیا تھا۔

وہ یادگار دن تھا۔ اس روز ہوا میں برساتی پودوں [illegible] رہے تھے اور کیکروں پر جھینگر بول رہے تھے۔ جھینگر جو ایک سانس میں اتنے زور سے چلائے جاتا ہے کہ کہیں پر دکھائی نہیں دیتا۔ پیڑوں پر جھینگر اور برساتی نالوں کے کنارے مینڈکوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی' اور گاؤں کے بچے اور کام چور نوجوان تلی کے جال کندھوں پر رکھ کر گپیں مارتے ہوئے مچھلیاں پکڑنے کو چل دیے تھے اور اپنی تفریح کے حق میں یہ دلیل دے رہے تھے [illegible] مچھلیاں [illegible] کھا کھا کر فربہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک لحاظ سے یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔

چند روز پیشتر نعیم کو جاٹ نگر میں جلسہ منعقد کرنے کے سلسلے میں دلی سے ہدایات موصول ہوئی تھیں۔ چنانچہ بارش سے بھیگے ہوئے چاروں کھونٹ میں اس نے اپنے گھڑ سوار دوڑا دیے اور خود بھی روزانہ فوجی برساتی اوڑھ کر جاٹ نگر جانے لگا۔ جاٹ نگر آس پاس کے دو سو گاؤں میں سب سے بڑا گاؤں تھا اور اناج اور کپاس کی بڑی بھاری منڈی تھی۔ انہوں نے منڈی کے احاطے میں جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بارش سے بچاؤ کی خاطر کئی سو ٹاٹ جوڑ کر بڑی سی ترپال بنائی گئی جسے موٹے موٹے رسوں کی مدد سے باندھ کر سائے کا انتظام کیا گیا۔ مگر قسمت سے اس روز دھوپ نکل آئی اور کیکروں پر جھینگر ایک تال سے بولنے لگے۔

صبح دس بجے نعیم گاؤں میں داخل ہوا تو پولیس کی جمعیت کو دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ اتنے دنوں سے جلسے کی خبر اڑنے کے باوجود جاٹ نگر میں پولیس کا کوئی آدمی نہ دیکھ کر وہ بے چین ہو رہے تھے۔ یہ جلسے جلوسوں کی ممانعت کا علاقہ تھا۔ ان کے دس میں سے نو اجتماع خلاف قانون ہوتے تھے اور وہ روز روز کی پولیس کی موجودگی کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ اس موقع پر ان کی غیر موجودگی انہیں کھٹکنے لگی تھی۔ آخر اس روز انہیں موجود پا کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ سب ہندوستانی پولیس کے لٹھ بند جوان تھے اور ان میں سے سوائے چند افسروں کے کوئی بھی مسلح نہ تھا۔ ان جلسوں میں ہر چند کہ خلاف قانون ہوتے' بلوے کا زیادہ امکان نہ ہوتا جس کی وجہ سے

مسلح گارڈ کی ضرورت نہ سمجھی جاتی اور زیادہ سے زیادہ لاٹھی چارج کی نوبت آتی۔

لاٹھیاں چمکا کر اکھڑ انداز میں چلتے اور کسانوں کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لسی پیتے ہوئے پولیس کے جوانوں کے پاس سے گزر کر نعیم مقررہ جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پولیس کی بھاری تعداد نے منڈی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ منڈی میں داخل ہونے کا واحد راستہ لکڑی کے لمبے لمبے تختے' جو رسوں کی مدد سے ایک دوسرے سے بندھے تھے' کھڑے کر کے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے آگے پہرہ لگا تھا۔

بڑی دیر تک ادھر ادھر سے اندر گھسنے کی ناکام کوششیں کرنے کے بعد نعیم اور اس کے ساتھیوں کو لکڑی کے تختوں کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھ رہنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ زمین گیلی اور اونچی نیچی تھی اور جگہ جگہ پر بارش کا پانی کھڑا تھا۔ جوں جوں سورج اوپر آتا جا رہا تھا دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور نم زمین میں سے بھاپ اٹھ اٹھ کر حبس پیدا کر رہی تھی۔ یہ برسات کا مخصوص' تکلیف دہ موسم تھا۔ اس کے ساتھ ہی زائرین جلسہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب تک سورج سر پر آیا' منڈی کے جلسے کا میدان اور اس سے آگے بازار کا ایک حصہ کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ یہ جاٹ نگر کے علاوہ اردگرد کے کئی گاؤں کے لوگ تھے جو جلسے کی خبر پا کر پہنچے تھے۔ اس ہولا دینے والے موسم میں انتظار کرتے کرتے جب کچھ بن نہ آئی تو انہوں نے واویلا شروع کر دیا۔

سب سے آگے نعیم اور اس کے ہمراہ چند لوگ' جو جلسے میں بولنے کے لئے دلی سے آئے تھے' زمین پر ٹانگیں پھیلائے [illegible] جو دیکھ لیتے۔ ان سے چند قدم پیچھے فاصلے پر پولیس کے سپاہی لاپروائی سے لاٹھیاں چٹکاتے ہوئے چل پھر رہے تھے۔ ان کے پیچھے لکڑی کے وہ تختے تھے جن کی حفاظت کا ذمہ ان کے سر تھا۔ لیکن اب وہ مجمعے کے خاموش احتجاج سے اس حد تک اکتا چکے تھے کہ تختوں کے دروازے کو چھوڑ کر دور دور تک چلے جاتے' کبھی بیٹھنے والوں کے پاس آ کر مصنوعی غصے کے ساتھ انہیں دھمکاتے اور کبھی ان کا مضحکہ اڑانے لگتے۔ کچھ دیر پہلے نعیم کی توجہ اس کے ایک ساتھی نے ایک تختے کی طرف دلائی تھی جو کسی وجہ سے ٹوٹ چکا تھا اور ایک پتلے سے رسے کے ذریعے لٹک رہا تھا۔ رستہ' جو تختے کے ٹوٹنے سے بن گیا تھا' ایک آدمی کے گزرنے کے لئے کافی تھا۔

وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے اور زمین کی گرم مرطوب بھاپ ان کے سروں میں چڑھتی رہی اور برسات کی کڑی دھوپ ان کے جسم پگھلاتی رہی اور طویل' صبر آزما' بیکار انتظار نے ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نعیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سپاہی' جس نے ابھی ابھی انہیں اپنی ماؤں کے ساتھ جا کر سونے کا مشورہ دیا تھا' پندرہ گز کے فاصلے پر پرے جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا کوئی اور ساتھی بھی دس دس گز کے فاصلے پر نظر نہ آ رہا تھا۔ دفعتاً نعیم نے ہوا میں ایک جست بھری اور ٹوٹے ہوئے تختے کے راستے سے صاف گزر گیا۔ ساتھ ہی اس کے تین چار ساتھیوں نے چھلانگیں لگائیں اور اسی راستے سے اندر داخل ہو گئے۔ تقریباً اسی وقت سارا ہجوم بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے پر ٹوٹ پڑا۔ تین چار تختے ایک ساتھ ٹوٹ گئے اور اچھلتے کودتے' ریلتے پیلتے ہوئے مضبوط' مختلف

کسانوں کا مجمع ایک دیوار کی طرح حرکت کرتا ہوا گزرنے لگا۔ یہ سارا واقعہ اس قدر تیزی سے اور میکانکی طور پر عمل میں آیا کہ چند لمحوں کے لئے پولیس کے سپاہی حیران و پریشان اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ایسا پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ پہلے کبھی اگر منتخب جگہ کو روک دیا جاتا تو لوگ جہاں اکٹھے ہو جاتے وہیں پر جلسہ کر لیا کرتے، لیکن یہ تو صریحاً سول نافرمانی تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ حواس یکجا کرتے پچاس کے لگ بھگ کسان اندر پہنچ چکے تھے۔ دیکھتے دیکھتے لکڑی کے تختوں کی باڑ دھڑام سے زمین پر آ گری اور چند لوگ اس کے نیچے آ کر زخمی ہو گئے۔ اب پولیس کی برستی ہوئی لاٹھیوں کے نیچے مجمع دوڑتا ہوا منڈی کے احاطے میں داخل ہونے لگا۔

نعیم بھاگتا ہوا کپاس کی گیلی گانٹھوں کے ایک ڈھیر پر جا چڑھا۔ سب سے اونچی گانٹھ پر کھڑے ہو کر اس نے لوگوں کو خاموش کرانے کے لئے سیدھا بازو فضا میں بلند کیا۔ آگے آگے کے لوگ خاموش ہو کر قریب سرک آئے اور آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ عقب میں مجمع ابھی تک دوڑ بھاگ رہا تھا اور پولیس کی لاٹھیاں برس رہی تھیں۔ نعیم نے بولنا شروع کیا۔

اس کا جلسے کو خطاب کرنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ اس کام کے لئے دلّی سے چند لوگ آئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ہجوم میں گم ہو چکے تھے اور نعیم اسی میکانکی قوت کے زیر اثر اوپر جا چڑھا تھا۔ اس کے پاس کہنے کو کوئی خاص بات نہ تھی پھر بھی اس نے بولنا شروع کر دیا اور کئی منٹ تک بے تکان بولتا چلا گیا۔ اس کا ایک بازو مستقل ہوا میں اٹھا ہوا تھا۔ [illegible] خیال [illegible] نے بولنا شروع کیا تھا اور کب ختم کیا' یا یہ کہ اس نے کیا کہا۔ بعد میں اسے صرف اتنا یاد رہا کہ وہ ان سے پُرامن رہنے کے سلسلے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن بے خودی کے اس لمحے میں اسے کسی شے کی خبر نہ رہی۔ اس نے ایک عجیب کیفیت اپنے اوپر طاری ہوتی ہوئی محسوس کی۔ اس کیفیت کے دوران صرف اس کی آنکھیں اور اس کا احساس کام کرتا رہا۔ اس کے سامنے بلکہ اس کے نیچے' پھیلتا سکڑتا' اٹھتا بیٹھتا اور پھٹتا دبتا ہوا مجمع نہ رہا تھا ایک ٹھوس اور چکدار' پھیلے ہوئے ربڑ کا وسیع حجم بن گیا تھا۔ فرد کا' یا افراد کے ہجوم کا تصور غائب ہو چکا تھا۔ اب یہ محض ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو اپنی ہی قوت کے تحت پھیل اور سکڑ' اٹھ اور بیٹھ رہا تھا اور جس کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ جو سب سے اوپر اکیلا کھڑا تھا' اکیلا اور قوی اور غالب خود مختاری کے اس لمحے میں اپنے آپ سے اس سارے منظر سے الگ ہو کر اس نے یہ سب دیکھا اور محسوس کیا اور اسے اپنے آپ پر ایک ایسی ہستی مطلق کا گمان ہوا اس ٹھوس' ابلتے ہوئے لاوے کے سیلاب کی تمام تر نقل و حرکت جس کے قبضے میں تھی۔ اپنے اس اختیار کو عمل میں لانے کے لئے اس نے بازو سے ہوا میں چند بے تکے اشارے بھی کئے۔ اس انوکھی کیفیت کو موثر طریقے پر الفاظ میں بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے لیکن یہ ان معدودے چند بلا خیز ذاتی تجربوں میں سے ایک تھا جن سے کہ عمر بھر میں اسے کبھی گزرنا پڑا تھا۔

جب وہ اسے گرفتار کرنے کے لئے آئے تو وہ بازو سر سے اوپر اٹھائے' منہ وا' پُرسکوت آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے جھٹکے سے اس کا بازو نیچے کیا اور جب وہ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنانے

لگے تو حیران رہ گئے۔

اسی موسم گرما کی ایک چمکدار صبح کو روشن پور کے باہر بہت سے بچے کنکروں کی گولیاں کھیل رہے تھے کہ اچانک ان میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ لڑ جھگڑ کر تتر بتر ہو گئے۔ لڑائی کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ کنکروں کے لین دین پر ہوگی، یا دھکم پیل میں کسی کے ضرب آ گئی اور وہ بیچ پا ہو گیا۔ بہرحال ایک مختصر سی دھینگا مشتی کے بعد سب نے اپنے اپنے قیمتی پتھر قبضے میں کیے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگہ، جہاں کچھ دیر پہلے چیخ پکار مچی تھی، ویران ہو گئی...... صرف ایک لڑکا جسے چند لڑکوں نے پکڑ کر زدوکوب کیا تھا، بیٹھا روتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے رونا بند کر دیا اور غصے میں بھرا انگلی سے مٹی میں لکیریں کھینچتا رہا۔ لکیریں کھینچتے کھینچتے اسے چند کنکر دکھائی دیے جو مٹی میں چھپے تھے اور افراتفری میں کسی کے رہ گئے تھے۔ اس نے انہیں اٹھا کر ہتھیلی پر رکھا، پھونک مار کر گرد اڑائی، پھر کرتے کے دامن سے رگڑ کر صاف کیا اور ان پر نظریں جما کر دیکھنے لگا۔ وہ بڑے خوبصورت پتھر تھے، شیشے کی طرح چمکدار اور دودھ کی طرح سفید۔ لڑکا انہیں جیب میں ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا اور گرد سے اٹا ہوا کرتا جھاڑ کر خوشی خوشی ایک طرف کو چل پڑا۔

اس سے پہلے بڑے لڑکوں کا جو جوم بکھرا تھا اس میں علی بھی تھا۔ اس نے عائشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ [illegible] جیب میں [illegible] اور ایک پتا نکال کر ان کی پپنیاں بناتی جا رہی تھی۔ لیکن پتے سخت اور خشک تھے اور گولانے کی کوشش میں ٹوٹے جا رہے تھے۔ جھلا جھلا کر ایک کے بعد ایک پتا پھینکتے ہوئے وہ ہاتھ کی پشت سے مستقل بالوں کی لٹ کو پیچھے کیے جا رہی تھی جو ہوا کے زور سے بار بار اس کی آنکھوں پر آ گرتی تھی۔ جب اس کی جیب کا ابھار نمایاں طور پر کم ہونے لگا تو اسے نقصان کا خدشہ ہوا اور وہ دیر دیر کے بعد پتے نکالنے لگی۔ ہر پتا نکالنے کے بعد وہ ہاتھ کی کشتی سی بنا کر جیب پر رکھتی اور پتوں کی مقدار کو جانچتی اور ہر بار گھٹتی ہوئی تعداد کا خیال کر کے اس کا دل دہل جاتا۔ پتوں کے ختم ہونے تک وہ صرف ایک بار پپنی کی آواز نکال سکی تھی اور وہ بھی چند سیکنڈ کے لیے۔ پھر پتا ترخ گیا اور ہوا پہلو میں سے سرکنے لگی۔ روکھی سی ہو کر اس نے آخری پتا منہ میں ڈال کر چبایا اور سبز رنگ کا تھوک اگلا۔ پھر وہ اداس سی ہو کر چلنے لگی۔ علی ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ، جو ان کے ہمراہ آ رہا تھا، باتیں کرنے میں مشغول تھا۔

''سلیمان نے جس بنٹے پر فساد کیا ہے اس کا میں الٹے ہاتھ سے نشانہ لگا سکتا تھا۔'' علی کہہ رہا تھا۔

علی کی بات سن کر دوسرا لڑکا، جو چھوٹی عمر کا مگر بہت بڑے سر اور چہرے کا مالک تھا، زعم میں آ گیا اور نتھنے پھیلا کر شیخی سے بولا: ''سلیمان؟ سلیمان تو رونے والا ہے رونے والا۔ میں اس بنٹے کا الٹے پاؤں سے نشانہ کر سکتا تھا۔ وہ روتا ہے اور فساد کرتا ہے۔ جب دھمکاؤ تو چوہا بن جاتا ہے۔ تم نے دیکھا؟'' بات ختم کر کے وہ فخریہ طور کے ساتھ ہنسا۔

"میں اسے جانتا ہوں۔ گھوڑ دوڑ پر ہماری گھوڑی اس کے پاس سے گزری تھی تو اس کی ہوا سے ہی وہ گر پڑا تھا اور دونوں پیشاب اس کے وہیں پر نکل گئے تھے۔" بات کو ختم کر کے علی نے بھی اپنے دوست کے فخریہ طرز کے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی، کیونکہ یہی ایک چیز تھی جس کی وجہ سے وہ اس بڑے سر والے بدصورت لڑکے کو پسند کرتا تھا اور اسے یہ احساس تھا کہ اس بات میں وہ کبھی ڈھنگ سے اس کی نقل نہ کر سکتا تھا۔

"تمہاری گھوڑی اچھی تھی۔ بیچاری بخار سے مر گئی۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔

"لیکن وہ گھاس کو سونگھتی بھی نہ تھی۔ بس سبز چارہ کھاتی تھی۔" علی نے کہا۔

"سبز چارہ پیٹ لگا دیتا ہے۔"

"اس کی قسمت ہی خراب تھی۔ جب سے مری ہے ہمارا چارہ خوب ہو رہا ہے۔"

"یہ چارے کا موسم ہے۔ کاٹ کاٹ کر ہاتھوں میں گٹھیاں پڑ گئی ہیں۔" اس نے چھوٹا سا سخت ہاتھ پھیلایا جس کی انگلیاں تڑخی ہوئی تھیں۔

"گٹھیاں اچھی ہوتی ہیں، تم گھوڑی کو خوب ٹھونک سکتے ہو۔" علی پھر اپنے پسندیدہ انداز میں ہنسا۔

"ہاں، گٹھیاں اچھی ہوتی ہیں۔ ایک بار پڑ جائیں تو پھر نہیں ٹوٹتیں۔"

اسی طرح راستہ چلتے ہوئے وہ بچوں کے شیخی خورے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ گاؤں کے باہر ایک شکستہ دیوار والے [illegible]

"میرا گھر آ گیا ہے۔" اس نے کہا۔ پھر کوئی مزید بات کیے بغیر وہ اپنے اپنے راستے پر ہو گئے۔

جب وہ دونوں اکیلے رہ گئے تو عائشہ نے علی کی آستین پکڑ کر کھینچی: "علی ... علی"

"ہنہ۔" وہ اکھڑوں کی طرح بولا۔

"ہمیں پیپل پر سے پتے اتار دو۔" لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

"کیوں؟"

"پپیاں بنائیں گے۔"

"کہاں ہے؟" علی اس طرف سے، جدھر پیپل تھا، نظر ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"وہ ہے۔ وہ ہے۔" عائشہ نے اس کا بازو کھینچا، کندھا کھینچا، پھر ٹھوڑی سے پکڑ کر چہرہ گھمایا اور انگلی ناک کی سیدھ میں کر کے درخت دکھایا۔ "وہ ہے۔"

"اچھا یچ؟" وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے بولا، یوں جیسے بڑی دقت سے پیپل کو دیکھنے میں کامیاب ہوا ہو۔

پیڑوں پر چڑھنے کا وہ شوقین تھا لیکن اس وقت عائشہ کی خواہش کے مقابل سخت گیر ہو گیا۔

"چلو۔" اس نے آہستہ لیکن بااختیار لہجے میں کہا۔

چوپال سے ذرا فاصلے پر اس نے بازو عائشہ کے کندھے پر سے اٹھا لیا۔

درخت کی جڑ کے پاس پہنچ کر رک گیا اور اونچی اونچی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''یہ... یہاں سے چڑھو۔'' عائشہ نے تنے کے بڑے بڑے سوراخوں میں اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ وہ چپکا کھڑا رہا۔ لڑکی تنے پر ہاتھ رکھ کر تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم راول کے ساتھ کیوں کھیلتی ہو؟'' علی نے سختی سے پوچھا۔

''راول؟ وہ بھی میرے ساتھ کھیلتا ہے۔''

''ہنہ۔'' اس نے غصے اور طنز کی ملی جلی آواز ناک میں سے نکالی۔ ''وہ اس پر نہیں چڑھ سکتا۔''

''اچھا۔'' عائشہ آنکھیں پھیلا کر بولی۔ ''پتا نہیں۔''

''پتا نہیں کیا ہوا؟'' وہ چیخا۔ ''وہ اس پر نہیں چڑھ سکتا۔ بس۔''

کچھ دیر تک وہ تند نظروں سے [illegible] کی طرف دیکھتا رہا پھر سامنے سے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا جہاں پر کہ چڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ننھی سی لڑکی سہمی ہوئی خاموش کھڑی اس کی پے درپے ناکام ہوتی ہوئی کوششوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس سے نہ رہا گیا اور تنے کے سوراخوں کی طرف اشارہ کر کے مری ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ...... اِدھر سے چڑھو۔''

''تم [illegible] اور [illegible] ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔ آخر وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ بندر کی طرح ایک سے دوسری شاخ پر پھلانگتے ہوئے اس نے سوکھے سوکھے پتے نیچے پھینکنے شروع کیے۔

UrduPhoto.com

''ہرے ہرے پتے پھینکو۔'' عائشہ نے کہا۔

''ہرے پتے نہیں ہیں۔'' وہ بے اعتنائی سے بولا۔

عائشہ ڈری ہوئی کھڑی خاموشی سے گرتے ہوئے خشک پتوں کو دیکھتی رہی۔ علی ایک شاخ کو گھوڑی بنا کر بیٹھ گیا۔

''یہاں کبھی راول آ سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' سہمی ہوئی آواز میں نیچے سے عائشہ نے جواب دیا۔ اس پر وہ خوش ہو گیا لیکن اپنی مسرت کا کھلے بندوں اظہار کرنے کی بجائے چالاکی سے ہونٹوں میں مسکراتا ہوا شاخوں میں پھرنے لگا۔ صرف اس نے اتنا کہا۔

''یہاں ہرے پتے بھی ہیں۔''

عائشہ دوڑ دوڑ کر سبز اور نرم پتے اٹھانے لگی۔ جب اس کی جیب بھر گئی تو خوشی سے منہ اٹھا کر بولی۔ ''اب آ جاؤ۔''

چوپال کی پھیلی ہوئی جڑوں پر بیٹھ کر وہ دونوں پیپیاں بناتے اور بجاتے رہے۔ سورج کے اٹھنے کے ساتھ ساتھ ہوا گرم ہوتی جا رہی تھی کہ مویشی اور کسان ہانپتے ہوئے جا کر سائے میں بیٹھ گئے اور گاؤں کی زمینوں اور

گلیوں میں ایک عام دیہاتی وحشت پھیل گئی۔ مشقت اور گرمی کے اس وقت میں علی اور عائشہ پیپل کی جڑوں پر بیٹھے چپنیاں بجا رہے تھے اور گپیں مار رہے تھے۔ پیپل کا سایہ گھنا اور خنک تھا اور گرمی کے مارے ہوئے کوے اور چڑیاں پتوں میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ادھر اُدھر پھدکیں کر رہے تھے۔ دونوں بچوں کے قریب سے ٹھنڈے کنوئیں کے پانی کی نالی ہلکے شور کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ اوپر سے ایک ایک دو دو کر کے چڑیاں آتیں' پانی میں ڈبکیاں لگاتیں اور پر جھٹک کر واپس چلی جاتیں۔ ان کے پروں سے پانی کے ننھے ننھے قطرے اڑتے اور ہوا کے زور سے بچوں کے گالوں اور آنکھوں پر آ گرتے۔

جب پتے ختم ہو گئے تو علی نے جیب میں سے پتھر نکالے اور پیپل کے تنے پر رگڑنے لگا۔

''پیپل کی چھال سے گھسنے سے چمک جاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

عائشہ نے بھی اپنے کنکر نکال کر تنے پر گھسنے شروع کر دیے۔ بیچ بیچ میں وہ چھوٹی چھوٹی بے ترتیب باتیں کرتے اور زور شور سے اپنے اپنے پتھر وضع پر گھستے جا رہے تھے۔ علی نے اپنا پتھر ہتھیلی پر رکھ کر اس پر تھوکا اور کرتے سے صاف کیا۔

''میرا چمک گیا ہے۔''

عائشہ نے بھی اس کی نقل میں اپنا پتھر تھوک سے صاف کیا اور دکھا کر بولی۔ ''میرا بھی چمک گیا ہے۔''

علی [illegible] لڑکی نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

پھر علی اکتا کر بیٹھ گیا۔ ''میرا زیادہ چمکدار ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرا بھی چمکدار ہے۔''

''میرا زیادہ ہے۔''

''نہیں میرا۔''

''نہیں۔'' علی آنکھیں نکال کر چیخا۔ ''میرا ہے' بس میں نے پتے اتار کر نہیں دیے تھے؟''

عائشہ مرعوب ہو کر چپکی ہو گئی۔ علی غصے میں بھرا آہستہ آہستہ پتھر جڑ پر رگڑتا رہا۔

''اگر زیادہ باتیں کرو گی تو گال کی چٹکی بھر لوں گا۔'' پھر اس نے کہا اور ساتھ ہی اس کے گال کی چٹکی بھر لی۔ عائشہ کا منہ لال ہو گیا۔ اس نے آتشیں نظروں سے علی کو دیکھا۔ غصے کے جھٹکے سے بالوں کی ایک لٹ اس کے بھبھوکا چہرے پر آ گری تھی اور وہ بپھری ہوئی اسے دیکھے جا رہی تھی' دیکھے جا رہی تھی۔ علی کھسیانا ہو گیا۔ بولا:

''کیوں' راول نے تمہارے گال کی چٹکی نہیں لی تھی کل؟ میں نے دیکھا تھا۔''

دفعتاً عائشہ رونے لگی۔ علی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لڑکی کی آواز لحظہ بہ لحظہ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

''اچھا' اب کچھ نہ کہوں گا۔ اب چپ ہو جاؤ۔'' اس نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ

UrduPhoto.com

روتی رہی۔

''اچھا۔ تم راول کے ساتھ جا کر کھیلو بیٹک۔ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ وہ اسی طرح روں روں کرتی رہی۔

''اچھا یہ لو'' علی نے کنکر آگے بڑھایا۔ اس کی چمک دیکھ کر عائشہ للچا گئی اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا' لیکن رونا بند نہ کیا۔

''یہ لو۔ میرے پاس اور بھی ہیں۔ سب تم لے لو'' علی نے سارے خوبصورت پتھر اس کے حوالے کر دیے۔ آہستہ آہستہ وہ خاموش ہو گئی۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ علی نے بازو اس کے کندھے پر رکھا اور وہ گھر کی جانب چل پڑے۔

ابھی وہ گھر سے ذرا فاصلے پر تھے کہ علی نے بڑی ماں کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ دوسری گلی میں غائب ہو گئی تو علی عائشہ کو کھینچتا ہوا بھاگنے لگا۔ مویشیوں کے احاطے میں داخل ہو کر وہ بولا: ''تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''مجھے بھوک لگی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔''

دبے پاؤں صحن میں داخل ہو کر اس نے دیکھا گرمیوں کی دوپہر اپنے عروج پر تھی جب اس کا جادو جو خاموشی اور ویرانی کا جادو ہوتا ہے' انسان اور حیوان پر یکساں چل چکا تھا۔ چھوٹی ماں کے کمرے کا کواڑ کھلا تھا اور وہ عائشہ کی ماں [illegible] صحن [illegible] سایہ تھا وہاں گائے اور اس کا بچھڑا آنکھیں میچے بیٹھے تھے اور دونوں کے سروں پر ایک ایک کوا بیٹھا خاموشی سے زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ کھلی اور ویران جگہوں کا ایک پُرسکوت سحر تھا جسے محسوس کر کے وہ دل میں خوش ہوا۔ صحن کو پار کر کے وہ بڑی ماں کے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ کوٹھڑی میں مٹی دیواروں کا ڈربہ سا بنا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس کا کواڑ ہٹایا اور اندر گھس گیا۔ ڈربے کی چاروں دیواروں میں سوراخ تھے اور دھواں جو سارے میں بھرا تھا' سوراخوں کے رستے آہستہ آہستہ باہر نکل رہا تھا۔ درمیان میں اپلوں کی آگ پر دودھ کی بھری ہوئی ہانڈی رکھی تھی۔ دودھ پر سرخ رنگ کی موٹی بالائی کی تہہ جم چکی تھی۔ علی دھوئیں سے اندھا ہو رہا تھا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر جانی پہچانی جگہ پر سے ایک لمبا سا ناڑ اٹھایا اور پھونک مار کر اسے صاف کیا۔ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بالائی کو احتیاط سے ایک طرف ہٹایا اور ناڑ کا ایک سرا دودھ میں ڈبو کر دوسرے سرے سے پینے لگا۔ سرخی مائل میٹھا گرم ریشمی سیال اس کے حلق میں اترنے لگا۔ دودھ گاڑھا اور مقوی تھا چنانچہ چند گھونٹ سے ہی وہ سیر ہو گیا۔ ناڑ کو دودھ میں سے نکال کر کرتے کے دامن سے صاف کرنے کے بعد اس نے اسے واپس رکھا' انگلی سے بالائی کو اپنی جگہ پر پھیلایا اور بے آواز قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تازہ ہوا میں دو چار لمبے لمبے سانسوں کے ساتھ دھواں' جو اس کی ناک اور حلق میں بھر گیا تھا' صاف کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''چلو۔''

عائشہ کے گلے میں بازو ڈال کر وہ چل پڑا۔ عائشہ چند قدم دھیرے دھیرے اس کے ساتھ چلی' پھر رک گئی۔

UrduPhoto.com

''تم کل جا رہی ہو؟'' علی نے پوچھا۔

وہ خاموش کھڑی رہی۔

''کیا ہے؟ چلو۔''

''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''جاؤ جا کر دودھ پی آؤ'' علی نے اس کے گلے سے بازو نکال کر کہا۔ ''ہمارا مت پینا۔ بڑی ماں کا پینا۔ اور سیدھے ہاتھ کے کونے میں میرا لاڑ پڑا ہے' اس سے پینا اور بالائی مت توڑنا' پی کر برابر کر دینا' نہیں تو پتا چل جائے گا۔''

وہ وہیں کھڑی بسورتی رہی۔

''جاؤ..... میں یہاں کھڑا ہوں۔''

''میں نہیں پیتی دودھ۔''

''کیوں؟''

''مجھے [illegible] ہوتی ہے۔''

''ہنہ'' علی اپنے پسندیدہ انداز میں ہنسا۔ ''عورتیں نخرے کرتی ہیں۔ میں دو سیر دودھ [illegible] سکتا ہوں۔ یہ مرد تو نخرے نہیں [illegible]

لومڑی کی طرح چلتا ہوا وہ بڑی ماں کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک اکیلے ہی زنگ آلود کنڈی کو کھولنے کی کوشش کرنے کے بعد وہ باہر آیا اور اشارے سے عائشہ کو بلا کر لے گیا۔

''کھڑی رہو۔ یہاں [illegible] بس۔ بیٹھنا نہیں' چونڈی گھماؤں گا نہیں تو۔'' اس نے آہستہ سے اس کے بالوں کی لٹ پکڑ کر کھینچی۔ لڑکی غصے سے سرخ ہوئی مگر چاروں ہاتھوں پاؤں پر گھوڑی بنی رہی۔ علی نے اس کے اوپر کھڑے ہو کر کنڈی کھولی اور وہ اندر داخل ہوئے۔

''ہٹنا دو'' اس نے عائشہ کی جیب سے ایک پتھر نکالا۔ اسے استعمال کرنے سے پہلے وہ دیر تک اوپر چھتی پر پڑی ہوئی گھڑیا کا نشانہ باندھتا رہا۔ پتھر عین نشانے پر پڑا اور کچی گھڑیا میں بڑا سا سوراخ ہو گیا جس میں سے گڑ کی ڈھیلیاں نیچے گرنے لگیں۔

انہیں جیبوں میں بھر کر جب وہ باہر نکل رہے تھے تو بڑی ماں صحن میں داخل ہوئی۔ دونوں بچوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ بڑی ماں وہیں سے چلائی۔

''ٹھہر جاؤ چورو۔ آج تمہاری بوٹیاں کروں گی۔''

وہ دونوں آگے آگے اور بڑی ماں اونچی آواز سے کوستی ہوئی پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ اسی طرح انہوں نے بھاگتے ہوئے صحن کے تین چکر لگائے۔ پھر وہ دونوں بچپن کی پھرتی اور قوت کے بل پر بوڑھی عورت کی زد سے نکل بھاگے۔

جب وہ احاطے سے باہر نکل رہے تھے تو عائشہ رونے لگی۔

''کیا ہے؟'' علی نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پیر جل گئے ہیں۔''

''ہنہ' یہ عورتوں کے نخرے ہیں۔'' وہ سختی سے بولا۔ ''لو' یہ گڑ کھاؤ۔''

عائشہ اس سے گڑ لے کر کھانے لگی۔

''تم کل جا رہی ہو؟''

''ہاں۔''

باہر سنسان دوپہر اسی طرح تپ رہی تھی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے جوہڑ کی طرف چلے گئے جدھر درختوں کا سایہ تھا۔

اگلے روز عائشہ اور اس کی ماں رخصت ہوئے۔ عائشہ کی ماں نے' جو علی کی خالہ تھی' اسے پاس بلا کر چوما اور سر پر پیار دیا' پھر دونوں ماں بیٹی گھوڑیوں پر سوار ہوئیں۔ جب دونوں بہنیں دنیا بھر کی باتیں کر چکیں تو گھوڑیاں' جو رخصت ہوتے ہوئے مہمانوں کو لے کر جانے کی عادی تھیں' بغیر اشارے کے چل پڑیں۔

دھوپ [illegible] کنارے [illegible] جوہڑ کے پانی میں ان کے زرد عکس دوسرے کنارے پر چلتے ہوئے کسانوں کو دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پانی میں ان کا عکس دیکھ کر چونکتے اور ان کی طرف اشارہ کر کے کہتے۔ ''نعیم کے جانور اچھی نسل کے ہیں۔ اس کی سواری جا رہی ہے۔'' وہ ادھیڑ عمر کسان ان کو دیکھ کر رکے' ایک نے ہاتھ ہوا میں اٹھا کر بلند آواز میں کہا۔ ''نعیم کی سواری' اللہ فضل کرے۔'' گو وہ نعیم کی بجائے علی کی خالہ تھی لیکن گاؤں کے لوگ خوشامد کے طور پر یہی کہہ کر بلاتے اور اس گھر کا ہر فرد نعیم کا نام اپنے نام کے ساتھ منسوب دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ کسان کے جواب میں اس نے دوسرے کنارے سے ہاتھ ہوا میں اچھالا اور منہ میں کہا۔ ''اللہ فضل کرے۔'' جس کی آواز دوسرے کنارے تک نہ پہنچ سکی۔ دونوں کسان تھوڑی دیر تک کھڑے سادہ' شہوانی نظروں سے اسے دیکھتے رہے' پھر ایک نے کہا۔ ''خوب عورت تھی' اب تو ڈھل گئی ہے۔'' اور ہنس کر اپنے راستے پر ہو لیے۔ اسی طرح انہیں راستے میں گاؤں کے سب رہنے والے ملے اور جو انہیں جانتے تھے انہوں نے اونچی آواز میں الوداع کہا اور جو نہ جانتے تھے انہوں نے محض پسندیدگی کی نظروں سے اسے اور اس کی گھوڑی کو دیکھا اور گھر جا کر اپنی عورتوں سے ان کا تذکرہ کیا اور اس طرح سارے گاؤں کو پتا چل گیا کہ گاؤں سے کون رخصت ہوا ہے۔ سوائے نعیم اور اس کی بیوی کے جو گاؤں سے باہر بڑے مکان میں رہتے تھے۔

علی جوہڑ کے کنارے پڑے پتھر پر بیٹھا تھا۔ آج دن بھر وہ کھیلتا رہا تھا اور ایک بار بھی کھیتوں پر نہ گیا تھا۔ دوپہر تک وہ ایک سو سے زیادہ بار عائشہ سے پوچھ چکا تھا۔ ''آج تم جا رہی ہو؟'' اور ہر بار اس کے اثبات میں

جواب دینے پر ایک سخت سی "ہنہ" کر کے بچپن کے غرور میں اس کو ٹال گیا تھا لیکن دوپہر کے بعد جب وہ گھوڑیوں پر سوار ہوئے تو وہ دفعتاً خاموش ہو گیا۔

جب عائشہ کی گھوڑی اس کے برابر پہنچی تو وہ اٹھ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟" عائشہ نے پوچھا۔

"راستہ خطرناک ہے' عورتوں کو اکیلے نہیں جانا چاہیے۔"

"کیا ہے؟"

"راستے میں بھیڑیے ہیں۔ جنگل میں....."

"ہنہ..... ہمارے پاس گھوڑیاں ہیں۔" عائشہ نے بدو ماغی سے جواب دیا۔

"وہ گھوڑیوں کو پھاڑ کھاتے ہیں اور عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔"

"ارے باپ رے۔" عائشہ آنکھیں پھیلا کر دہشت سے بولی۔ "پھر؟"

"کوئی فکر نہیں۔ میں ساتھ جاتا ہوں۔"

عائشہ احسان مندی سے اس کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

انہوں [illegible] اور اب [illegible] کی باتوں میں چل رہے تھے۔

عائشہ کی ماں کی گھوڑی آگے نکل چکی تھی اور علی بینے پر بازو باندھے عائشہ کی گھوڑی کے ساتھ چل رہا تھا۔ مختلف کھیتوں اور پگڈنڈیوں پہ چلتے ہوئے وہ ادھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ عائشہ جو گھڑ سواری اور گھر جانے کے خیال سے کافی مسرور تھی بڑے اشتیاق سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ مثلاً یہ کہ کس طرح وہ ایک دفعہ تین بھیڑیوں کو جل دے کر ان کے پیچھے سے نکل آیا تھا اور یہ کہ اس جنگل میں جو ایک عجیب سا درخت تھا اس کے نام کا کسی کو پتا نہ تھا مگر اس کے پتوں کی کھاد بڑی عمدہ بنتی تھی' اور یہ کھیت' جن میں سے وہ گزر رہے تھے' ان کے نہیں بلکہ دوسرے گاؤں کے تھے اور ان کے کھیتوں کی طرح زرخیز نہ تھے کیونکہ اس گاؤں کے لوگ کام چور اور کھلنڈرے تھے اور محنت سے جی چراتے تھے۔ اور یہ کہ بھیڑیے مردوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے بلکہ عورتوں کو دبوچتے ہیں' ان کے زیورات اور قیمتی کپڑے اتار کر اپنی بیویوں کو پہناتے ہیں اور عورتوں کو ان کی خدمت پر مامور کر دیتے ہیں۔ عائشہ نے بھیڑیے کی بیوی کی خدمت گار بننے کے خیال پر خوف اور تعجب کا اظہار کیا۔ پکی سڑک پر پہنچتے پہنچتے ان کو شام ہو گئی۔

گھوڑی سخت اور ہموار زمین کو محسوس کر کے خوشی سے ہنہنائی اور تیز ہو گئی۔ علی ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ عائشہ نے' جو اچھی خاصی سوار تھی لیکن گھوڑی کی عادتوں سے واقف نہ تھی' اسے روکنے کے لیے باگیں کھینچیں۔ گھوڑی نے اگلے پاؤں اٹھا کر ہوا میں چلانے شروع کر دیے۔

''میں اس کے ساتھ دوڑ سکتا ہوں۔ اسے چھوڑ دو۔'' علی نے کہا۔

''ابھی یہ چاروں پاؤں پر آجائے گی۔''

''تو کیا ہے۔ میں خرگوش کی طرح دوڑتا ہوں۔'' وہ تیزی سے بھاگنے لگا۔

''تو لو...... '' عائشہ باگیں ڈھیلی چھوڑ کر بولی اور چٹ کر بیٹھ گئی۔ ڈھیل پا کر گھوڑی آسانی سے دوڑنے لگی۔

''میں اس سے بھی تیز دوڑ سکتا ہوں۔'' علی نے دانت پیس کر کہا اور سر گھوڑی کے سر سے آگے نکال لے گیا۔ عائشہ نے آہستہ سے ایڑیاں گھوڑی کی پسلیوں پر ماریں۔ گھوڑی چار پاؤں پر دوڑنے لگی۔ علی اب پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا اور تیز ہوا کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ پل کے پل میں گھوڑی فراٹے بھرتی ہوئی اس کے پاس سے نکل کر گرد کے طوفان میں غائب ہو گئی۔

جب گرد و غبار ذرا کم ہوا تو اس نے دیکھا کہ سوار اور گھوڑی دونوں حد نظر سے باہر جا چکے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جا کر پلیا پر بیٹھ گیا۔ نیچے ایک تھما سا برساتی نالہ بہہ رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا جو اندھیرے میں اس کی نظروں سے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے طبیعت میں سخت بدمزگی محسوس کی۔ اس کے دل میں ایک محبوب دوست کے بچھڑنے کا رنج تھا مگر ابھی وہ اس عمر کو نہ پہنچا تھا کہ اس رنجیدہ جذبے کو پہچان سکتا۔ چنانچہ وہ پلیا پر بیٹھا بے دلی سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ قریب کی فصل میں سے ایک گیدڑ کان کھڑے کر کے نکلا اور نالے پر پانی پینے لگا۔ علی وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

اب اسے پتا چلا کہ وہ ننگا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا تو جوتے اس کے پاؤں سے اتر گئے تھے۔ وہ اندھیرے میں سر جھکا کر دیکھتا ہوا اسی راستے پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر ایک جوتا مل گیا لیکن بہت تلاش کرنے کے بعد بھی دوسرا جوتا نہ ملا۔ رات چاروں طرف پھیل گئی تھی اور وہ اکیلا تاریک راستوں کو دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ رنج سے مجبور ہو کر وہ رونے لگا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں نے جھپٹ کر اسے گود میں لے لیا اور اس کا ماتھا چوم کر بولی:

''کیوں روتا ہے میرے لال۔ ایں؟ بتا۔''

''میرا جوتا کھو گیا ہے۔'' اس نے بمشکل کہا۔

''پھر کیا ہے۔ چپ ہو جا میرے لال' وہ پرانا اور پھٹا ہوا جوتا تھا۔ مت رو۔''

لیکن اس رات وہ پرانے اور پھٹے ہوئے جوتے کے علاوہ اور بہت سے انجانے رنج کی وجہ سے دیر تک لیٹا سسکیاں لیتا رہا۔

UrduPhoto.com

(۳۲)

جیل جانے کا خیال نعیم کے لئے انوکھا نہ تھا۔ اس سے پہلے اس کے ہزاروں ساتھی جیل جا چکے تھے پھر بھی جیل کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے وقت اس کے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ گئی اور دل کے دھڑکنے کی آواز اس نے صاف طور پر سنی کہ بالآخر یہ ایک ان دیکھی اور انجانی دنیا تھی۔

وہ اپنی دس فٹ مربع کوٹھڑی میں بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا تھا اور آستین سے آنکھیں پونچھتا جا رہا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک چھوٹا سا سوراخ روشن دان کے نام کا تھا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ روشنی کے لئے ایک مٹی کا دیا تھا جس میں گاڑھا، سیاہ رنگ کا تیل جل رہا تھا جو مرچوں کی طرح آنکھوں کو لگتا تھا۔ فرش اور دیواریں پتھر کی تھیں جن پر مٹی کی ایک دبیز تہہ چڑھ چکی تھی اور اس میں کیڑے مکوڑے اور بچھوؤں کے چلنے سے لکیریں بن گئی تھیں۔ ایک کونے میں چٹائی بچھی تھی جو کہ اس کا بستر تھا۔ سالن نمک مرچ اور دال کے چند دانوں کو پانی میں ابال کر بنایا گیا تھا اور روٹی کے آٹے میں ریت اور مٹی ملی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود سارے دن کی بھوک کے مارے اس نے بکری کی طرح وہ کھانا کھا لیا اور کھانے کے دوران دل میں پریشان ہوتا رہا کہ دھواں جو بادل کی طرح اس کے کمرے میں بھر گیا تھا، کس طرح صاف ہوگا اور وہ اس میں کیسے سو سکے گا۔ لیکن جیل میں پہلا دن گزارنے کا تجربہ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد جب ذرا آرام ہوا تو اسے خود بخود نیند آنے لگی۔ اس نے کونے میں پڑے ہوئے ایک پتھر کو اٹھا کر چٹائی کے سرہانے کی جگہ پر رکھا اور اس پر سر رکھ کر لیٹ گیا، لیکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کو دھاریوں میں بہتے ہوئے پسینے کو خشک کرنے کے لئے اٹھنا پڑتا۔ برسات کے اوائل کی حبس کی رات تھی اور نعیم کے اردگرد دھواں اور پرانی، سال خوردہ ہوا بھاری تہوں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ایک دفعہ پسینہ پونچھتے ہوئے آستین لگنے سے دیوار کی مٹی اڑی اور اس کی ناک میں جا گھسی۔ وہ چھینکتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت یہ سوچ کر دل میں اسے افسوس ہوا کہ اس کے ساتھ نچلے درجے کے اخلاقی قیدیوں کا سا سلوک کیا گیا تھا۔

وہ بہت دن کے بعد زمین پر سویا تھا۔ رات میں کئی بار اس کی آنکھ کھلی اور اسے ان دنوں کا خیال آیا جب وہ جنوبی ہندوستان کے گاؤں اور شہروں میں ایک لمبے عرصے تک زمین پر سوتا رہا تھا۔ صبح جب وہ جاگا تو آنکھیں بند کئے کئے اس نے عادتاً اپنی بیوی کو پکارا۔ کمرے میں وہی جمود تھا، لیکن دھواں غائب ہو چکا تھا اور دن کا اجالا دروازے میں سے اندر آ رہا تھا۔ سامنے جیل کی اونچی دیوار تھی اور دھوپ کہیں پر نظر نہ آ رہی تھی۔ آسمان کا وہی چھوٹا سا حصہ دکھائی دے رہا تھا جو اس نے کل کوٹھڑی میں داخل ہونے کے بعد دیکھا تھا۔ سامنے ایک عجیب نظارہ تھا۔ کھلی جگہ میں لوہے کی سلاخوں کا ایک اونچا اور گول سا جنگلہ بنا تھا جس کے اندر بہت سے لوگ لکڑی کے ایک شہتیر کو کھینچتے ہوئے گول دائرے میں گھوم رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ کنوئیں میں سے پانی کھینچنے

کے لئے بیلوں کی جگہ پر کام کر رہے تھے۔ ایک بدنما چہرے والا شخص ان کی نگرانی پر کھڑا تھوڑے تھوڑے وقفے پر گالیاں دے رہا تھا۔ چڑیا گھر کے سے اس منظر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے نعیم نے گننا شروع کیا۔ وہ تعداد میں اٹھارہ تھے اور برابر حکمران کو اور ایک دوسرے کو کوس رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ دروازے کی سلاخوں پر ہاتھ رکھے رکھے وہ ان کی اس بے حس خوش دلی پر محظوظ ہوتا رہا۔

پھر اپنے قریب ہی ایک کرخت انسانی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ یہ ایک اتنے ہی کرخت نقوش والا شخص تھا جو قیدیوں کے لباس میں تھا اور بازو پر 'ڈبلیو۔ او' (وارڈ اوورسیئر) کا بلا لگائے ہوئے تھا۔ وہ ایک دوسرے قیدی کو گردن سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بڑے 'معمولی' روزمرہ کے انداز میں گالیاں دے رہا تھا۔ جواب میں قیدی بھی گالیاں دے رہا تھا اور قسمیں کھا رہا تھا۔ نعیم کے برابر پہنچ کر وہ رکا اور کوری کوری نظروں سے اسے تکنے لگا۔

"سورج نکل آیا ہے؟" نعیم نے پوچھا۔

"ہاں' ابھی ایک چیل گزری تھی۔" اس نے [illegible] لہجے میں جواب دیا۔

(جلد ہی نعیم قیدیوں کے اس طریق سے واقف ہو گیا' جب وہ خود بھی سر اٹھا کر آسمان کے اس حصے کو جو ان کے سروں پر تھا دیکھنے اور پرندوں پر پڑتی ہوئی دھوپ سے طلوع و غروب کا اندازہ لگانے لگا۔)

"رات بھر تم کتے کی طرح سوئے رہے۔" وارڈ اوورسیئر پھر اسی ناخوشگوار آواز میں بولا۔

رات [illegible] سارے جسم کے ساتھ دروازے [illegible] دھکیلا: "کتے۔" اس نے خشمگیں لہجے میں کہا۔

وارڈ اوورسیئر بے حس نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ منجمد چہرے کے ساتھ منہ کھول کر ہنسا:

"میں تین بار یہاں [illegible] گزار [illegible] تمہیں پتا ہے؟"

"یہاں آؤ۔" نعیم نے غصے کو دبا کر کہا۔ وہ بے شرمی سے چلتا ہوا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ نعیم نے سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر زور سے گھونسہ اس کی ناک پر مارا۔ "سور!"

اس غیر متوقع حملے سے وہ لڑکھڑا گیا اور ناک کو چھو کر بولا: "کیوں...... کیوں!"

"گالی کیوں دی؟" نعیم نے کہا۔

"گالی؟" کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے کئی بار ناک چھو کر دیکھا۔ "گالی؟"

"ہاں۔ میں نے چوری نہیں کی۔"

"پھر کیا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے؟...... میں نے......" نعیم نے بے خیالی سے اس کی ناک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں کیا۔"

"قتل کیا ہے؟"

"نہیں۔"

''زنا کیا ہے؟''

''نہیں'' نعیم چیخا۔

''پھر تمہارا دماغ چل گیا ہے۔'' وارڈ اوورسیئر نے کہا۔ ''مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی سزا تم کو ملے گی۔ کتے کے بچے۔''

وہ نفرت سے اسے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ نعیم کا جی چاہا کہ دروازے کی سلاخوں کو چبا ڈالے' لیکن جب وہ چلا گیا تو دفعتاً وہ اپنی پیش قدمی اور اس دوسرے شخص کی شدید بے حسی پر دل میں خوف زدہ ہو گیا۔

دن کی روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی لیکن دھوپ کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ سامنے جنگلے کے اندر قیدیوں کے پانی کھینچنے کا نظارہ کرتے کرتے اچانک نعیم کے دل میں ایک بے کلی پیدا ہوئی۔ دھوپ کہاں تھی؟ اور پرندے آسمان کا مختصر سا حصہ اس کی نظروں کے سامنے بے رنگ اور ویران تھا۔

وہ قیدی' جسے وارڈ اوورسیئر وہاں چھوڑ گیا تھا اس کے قریب آیا۔

''مجھے مت مارنا۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔'' اس نے نعیم کی زد سے باہر رہتے ہوئے کہا۔ نعیم خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ بھی دیکھنے والے میں تنفر اور ناگواری پیدا کرتا تھا' گو کبھی خوبصورت رہا ہو گا۔

''تم کیوں آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''[illegible] کے بعد کہا۔

''یہاں پر تم کچھ نہیں چھپا سکتے۔ دو دن میں تمہاری اصلیت کا پتا چل جائے گا۔ شکل سے تو کچھ ایسے حرامی معلوم نہیں ہوتے۔''

''میں نے سوراج کے لئے تقریر کی تھی۔'' نعیم نے جلدی سے کہا۔

''سوراج؟''

''آزادی۔ آزادی کے لئے۔''

اس کی آنکھوں میں امید کی ایک رمق ظاہر ہوئی: ''آزادی؟ ہم آزاد ہو جائیں گے؟''

''نہیں' ملک کی آزادی کے لئے۔''

''ملک؟ ایں...... اور ہم؟''

''پہلے تمہارے ماں باپ اور بیوی بچے اور زمینیں آزاد ہوں گی۔ پھر جب تمہاری سزا ختم ہو جائے گی تو تم بھی آزاد ہو جاؤ گے نا۔''

''آہاہاہا'' وہ دیوانوں کی طرح ٹکٹکی باندھ کر ہنسا۔ اس کے چہرے پر ہنسی کی رمق تک نہ بکھری۔ نعیم نے اپنی پشت پر خوف کی سرسراہٹ محسوس کی۔ ''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ جب میرے ماں باپ اور بیوی بچے اور زمینیں سب مر چکی ہوں گی۔''

''مرچکی ہوں گی؟''

''یہ دیکھو۔'' اس نے کندھا آگے بڑھایا جس پر اس کی تاریخ رہائی 1972ء لکھی تھی۔

''اڑتالیس سال اور۔''

''ایں؟'' نعیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

وہ دوبارہ منہ کھول کر ہنسا۔ ''یہ تقریر والی تو تم بکواس کر رہے ہو' لیکن تمہارے جھوٹ کا ہمیں پتا چل جائے گا۔ چرس پیو گے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟ پیسے نہیں ہیں' نواب کے بچے' یوں تو کتے کی گالی پر تیغ پا ہوتے ہو۔''

''جاؤ اپنا کام کرو۔'' نعیم نے خاموش غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے بیٹا۔'' قیدی جاتے جاتے مکاری سے بولا۔ ''میں تمہارا دوست ہوں۔ چرس کی ضرورت پڑے تو مجھ سے کہنا۔''

غصے کے ساتھ ساتھ نعیم کے دل میں اس کے لئے رنج پیدا ہوا۔

ایک وارڈر نے آ کر اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور گندم کی آدھی بوری چکی کے پاس رکھ دی۔

''[illegible] نعیم اب آشنا ہوتا جا رہا تھا' کہا پھر جاتے جاتے اس کی نظر ان چھوئے کھانے پر پڑی اور وہ رک گیا۔ ''تم نے کھانا نہیں کھایا؟''

''یہ؟ یہ جانوروں کا کھانا؟'' نعیم نے رک رک کر کہا۔

''اہا...... بیل کے بچے' تو تم اپنی ساس کے گھر آئے ہو۔'' پھر وہ ایک دم آنکھیں نکال کر چیخا۔ ''سنو۔ اگلے ہفتے تمہارا وزن ہوگا۔ اگر ایک تولہ بھی کم ہوا تو تمہیں مویشیوں کا گوبر کھلایا جائے گا۔ سنا؟'' دروازہ بند کرتے ہوئے سلاخوں میں ناک ٹھونس کر پھر چیخا۔

''تم نے بیلوں کو دوا پلانے والی نال دیکھی ہے؟ تم جیسے کتوں کو گوبر کھلانے کے واسطے ہم اس کا استعمال کرتے ہیں۔''

نعیم زخمی سوئر کی طرح اسے دیکھتا رہا۔

دن بھر وہ چکی پیستا اور بار بار اٹھ کر دروازے کی طرف جاتا رہا۔ کئی بار اس نے دروازے کو دھکیل کر' بیٹھ کر اور لیٹ کر باہر کی دنیا کو ذرا دور تک دیکھنا چاہا' لیکن آسمان کو دیواروں سے باندھ دیا گیا تھا اور اس پر کوئی پرندہ نہ تھا۔ دوپہر کے قریب ایکا ایکی گرم سورج دیوار کے عقب سے اس کے سامنے آ گیا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں پھیر لیں۔ دھوپ کڑی اور بے رنگ تھی۔ وہ واپس چکی کی طرف لوٹ آیا اور پیٹ میں بھوک محسوس کر کے کھانے پر پل پڑا۔

UrduPhoto.com

آسمان پر ابھی اجالا تھا جب جیل کا ایک افسر اور ایک وارڈر اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ وہ چکی پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ جیل کے افسر نے جوتے کی نوک اس کی پسلی کی چھوئی۔

''تم نے ڈبلیو۔ او۔ نمبر 19 کو مارا تھا؟ آج صبح۔''

''ہاں۔'' گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے نعیم نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

یہ کہتے ہوئے کہ اس نے اسے گالی دی تھی نعیم جھجک گیا کہ اب وہ ان گالیوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ وہ خاموش رہا۔

''اٹھو'' جیل کے افسر نے پھر اس کے پہلو میں جوتے کی نوک ماری۔ ''اس کے لئے تمہیں پانی کھینچنا پڑے گا۔''

باہر نکل کر اس نے کسی بات پر جو اس کے نگران آپس میں یا اس کے ساتھ کر رہے تھے' دھیان نہ دیا اور خوشی سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ سہ پہر کی زرد دھوپ میں چند کبوتر اس کے سر پر سے گزر رہے تھے۔ اس نے چند لمحے کے لئے آزادی کا سرور محسوس کیا۔ آہنی جنگلے میں پہنچ کر اس نے تیز کرخت آوازوں میں غل مچاتے اور پانی کھینچتے ہوئے قیدیوں کو قریب سے دیکھا۔ چوبیس گھنٹے تک تنہائی میں رہنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اپنے دوستوں [illegible] کر کے رسہ پہنانے لگا۔

''ایک اور بیل آیا ہے۔'' قطار میں سے آواز آئی۔

''سور کی طرح پلا ہوا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ قطار میں سے زوردار ہنسی کی آواز بلند ہوئی۔ نعیم کا جی اس خوشدل گروہ کے ساتھ گھلنے ملنے اور باتیں کرنے کو چاہنے لگا۔ اس نے اپنے ساتھ والے سے پوچھا۔ ''تم کسان ہو؟''

''میں بیل ہوں۔'' اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ پسینے میں بھیگے ہوئے' ہانپتے ہوئے قیدیوں کی قطار سے پھر ہنسی کی آواز اٹھی۔

ہر چکر پر وارڈ اوورسیئر اس کی پسلیوں پر چھڑی مارتا جا رہا تھا۔ پہلے چند چکر تو باہر آنے کی خوشی میں اس نے آسانی سے مکمل کر لئے' پھر اس کی کمر اور ٹانگوں میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت اس کے دل میں اپنی اور اس نوع کی مشقت کرنے والے دوسرے انسانوں کی شدید ذلت کا احساس پیدا ہوا۔ جسمانی تکلیف اور خفت کے احساس میں اس نے نگران کی گالیوں اور چابکوں کو نظر انداز کر دیا۔

جب انہیں کھولا گیا تو چند منٹ تک وہ آنکھیں بند کئے کھڑا اپنے جسم کی منتشر اور ضائع ہوتی ہوئی توانائی کو یکجا کرتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر وارڈ اوورسیئر نمبر 19 کو دیکھا۔

''تمہارے پاس سگریٹ ہیں؟''

''کیوں' نوابی ختم ہو گئی؟'' وارڈ اوورسیئر نے رعونت سے کہا۔ نعیم خفت سے ہنس کر ناک کھجانے لگا۔

''چلو'' وارڈ اوورسیئر نعیم کو لے کر اس کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔ ''تم اگر مجھ سے صلح رکھو تو میں سگریٹ مہیا کر سکتا ہوں؟''

''میں تمہاری طرح باہر پھر سکتا ہوں؟'' نعیم نے پوچھا۔

''نہیں۔ ہم عمر قید والے ہیں۔ ہم نے اچھا چال چلن دکھایا ہے اس لیے ہمیں ڈھیل دے دی گئی ہے۔ میں نے بارہ سال کاٹ لئے' بتیس سال اور ہیں۔ دیکھو'' اس نے اپنا کندھا دکھایا جس پر اس کی تاریخ رہائی 1956ء لکھی تھی۔ دروازہ بند کر کے جاتے ہوئے وہ بولا: ''اب تم نے کسی پر ہاتھ اٹھایا تو درے لگیں گے۔ سنا حرامی؟''

شام کے وقت وہ اندھیرے میں بیٹھا تھا کہ کسی نے دروازہ کھولا۔

''اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہو؟'' تحکمانہ لہجے میں کوئی بولا۔

''تمہارا باپ آنکھوں کو لگاتا ہے دھواں۔'' نعیم نے جل کر کہا۔

''دیا جلاؤ۔ یہاں چالاکیاں نہیں چلیں گی۔'' چلنے والے کو چکی کی ٹھوکر لگی اور اندھیرے میں اس کے کوسنے کی آواز آئی۔

[illegible] ''میں بھاگ کر [illegible] جاؤں گا [illegible] بے فکر رہو۔'' نعیم نے کہا۔

''ہنہ'' دوسرا شخص بڑبڑایا۔ یہ وہی اوورسیئر تھا جس نے صبح کو اسے کوڑے لگا کر اس کا وزن بڑھانے کی دھمکی دی تھی۔ ''یہ؟ یہ سارا؟ کام چھوڑ گدھے کے بچے ...... ہیں؟'' وہ یکلخت چیخا۔

''میں اس سے زیادہ نہیں پیس سکتا۔''

''کیوں؟'' وہ جارحانہ انداز میں بڑھا۔

''میرا ایک ہاتھ ہے۔'' نعیم نے چیخ کر کہا اور جلدی سے بازو ننگا کر کے آگے بڑھایا۔ ''دیکھو...... دیکھو۔''

''ہیں۔'' حیرت کے مارے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کپکپاتی ہوئی انگلیوں کے ساتھ نعیم نے آستین اتار کر اسے ڈھک دیا۔

''دو...... مجھے دو۔'' اوورسیئر نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھایا۔

''تم اسے نہیں رکھ سکتے۔ یہ قانون ہے۔ دو۔'' اس نے لکڑی کی انگلیوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا' جس سے نازک کمانیاں کھل گئیں اور لکڑی کا ٹکڑا بازو سے الگ ہو گیا۔

نعیم نے بھیڑیے کی طرح دانت نکال کر جھپٹا مارا اور لکڑی کا ٹکڑا اس سے چھین لیا۔ ایک پل کے لئے اس نے اپنے آپ کو تولا اور پھر ہاتھ اٹھا کر لپکا۔ اوورسیئر تیزی سے باہر نکل کر غائب ہو گیا۔ ٹکڑا ہاتھ میں لٹکائے

UrduPhoto.com

لگائے نعیم جنگلی جانور کی طرح کمرے میں چکر لگاتا رہا۔ غیظ کی حالت میں اس کی سوچنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ جبلی طور پر خطرے کو محسوس کر کے اس نے اسے چکی کے نیچے چھپا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جیل سپرنٹنڈنٹ' جیلر' اوورسیئر اور ایک سپاہی اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔

''کہاں ہے؟'' سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

''میرا ایک ہاتھ ہے۔'' نعیم نے آستین چڑھا کر اسے کٹا ہوا بازو دکھایا۔

''لکڑی کا کہاں ہے؟''

نعیم خاموش بیٹھا بازو پر ہاتھ پھیرتا اور زیر لب بڑبڑاتا رہا۔ ''میرا ایک ہاتھ ہے...... ایک ہے۔''

چکی کے نیچے سے اسے تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دیر نہ لگی۔ کچھ دیر تک وہ سب تعجب اور دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھتے رہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی کاریگری کی تعریف کرتے رہے۔ پھر وہ اسے لے کر باہر نکل گئے۔

''جب تم جاؤ گے تو دے دیا جائے گا۔'' جاتے جاتے سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

بریکٹ کی اس بند رات میں آدھے بازو کو پکڑ کر لیٹے لیٹے اس کے دل میں بیکراں تنہائی اور عظیم نقصان کا احساس پیدا ہوا' جیسے اس کے تمام ساتھیوں کے کارواں اسے چھوڑ کر آگے نکل گئے ہوں۔

ا[illegible] وہاں [illegible] اور وہاں کے [illegible]وں سے مانوس ہو گیا' جس طرح انسان تقریباً ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس پر بھی ایک خلش' جو ہر ذہین انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے' اس کی روح میں چھپی رہی۔ کبھی کبھی وہ خلش باہر نکل کر ایک بھاری درد کی طرح اس کے سارے جسم کو جکڑ لیتی اور ان دنوں میں وہ بے حد آزردہ ہو جاتا۔ یہی چیز تھی جو اسے وہاں کے معمولی باسیوں سے ممتاز کرتی تھی اور جس نے دوسروں کو اس کی عزت کرنے پر مجبور کیا۔

ان قیدیوں میں معمولی اخلاقی قیدی تھے جن کی سزائیں نسبتاً مختصر تھیں۔ اس کے بعد عمر قید والوں کا عجیب و غریب گروہ تھا۔ عموماً عمر قید چودہ یا بیس سال کی ہوتی ہے لیکن بعض اوقات انہیں اس سے کہیں زیادہ لمبی سزا بھگتنا پڑتی' مثلاً کئی کئی جرموں کا ایک ساتھ مقدمہ چلایا جاتا اور سب کی سزائیں جمع کر کے ان پر عائد کر دی جاتیں۔ نعیم کے جیل میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو کئی کئی سال جیل میں گزار کر ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے تھے اور ابھی ان کی سزا کے بیس بیس اور تیس تیس برس باقی تھے۔ یہ لوگ' جو اپنی عمروں کا بہترین حصہ جیل میں گزارتے ہیں' سالہا سال تک کوئی عورت یا بچہ یا مذہبی رہنما نہیں دیکھتے۔ وہ باہر کی دنیا سے علیحدہ اور قطعی بے خبر ہوتے ہیں اور اپنی عمریں ہر قسم کے دوستانہ انسانی رشتوں سے دور رہ کر بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نفرت اور انتقام کے مکروہ انسانی جذبات میں لپیٹ لیتے ہیں اور زندگی کی اچھائیوں اور مہربانیوں کو یکسر بھول جاتے ہیں حتیٰ کہ آہستہ آہستہ ان کے ناپاک جذبات بھی معدوم ہو جاتے ہیں اور ایک اذیت ناک بے حسی ان پر طاری ہو جاتی ہے۔ نعیم کو ابتدا میں انہی لوگوں